۲۴

تم اس مقام پر کھڑے ہو جاؤ کہ دنیا تمہاری نقل کرے

(فرمودہ ۳/ جولائی ۱۹۳۶ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

کئی ہفتے ہوئے ہیں مَیں اعمال صالحہ کے متعلق مضمون بیان کررہا تھا کہ ہمارے عقائد میں ہماری جماعت کی کوششیں نہایت بارآور اور کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ ہمارے عقائد کی صحت کو ہمارے دشمنوں نے بھی تسلیم کرلیا، کھلے طور پر اپنالیا اور اختیار کرلیا ہے اس کے مقابلہ میں اعمال کے بارہ میں ہماری جماعت کی کوششیں ایسی بارآور اور کامیاب نہیں ہیں حتّٰی کہ غیر تو غیر خود اپنی جماعت کے لوگ بھی یہ مانتے ہیں کہ اس بارہ میں ہمیں وہ مقام حاصل نہیں کہ جو دنیا کیلئے نمونہ کہلا سکے حالانکہ ارادہ اور نیت اعمال کے متعلق بھی ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ عقائد کی درستی کیلئے۔ پس جب محرک یکساں طاقت کا موجود ہے تو ایک جگہ ارادہ کا کم سے کم اثر اور دوسری جگہ زیادہ سے زیادہ اثر بتاتا ہے کہ بیرونی مخالفت ایک کی کم اور دوسرے کی زیادہ ہے۔

دنیا میں کام کرنے کی دقتیں دو ہی ہیں ایک قوتِ مؤثرہ کی کمی اور دوسرے قوتِ متأثرہ کی کمی۔ یا تو ناکامی اس لئے ہوتی ہے کہ کام کے پیچھے قوتِ ارادی اتنی مضبوط نہیں ہوتی جس کے ذریعہ وہ کام ہوسکتا ہے یا پھر قوتِ ارادی تو ہوتی ہے مگر بیرونی مخالفت اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس پر غالب آجاتی ہے۔ مثلاً ایک طالب علم ہے وہ ارادہ کرتا ہے کہ سبق یاد کرے مگر ایک اور طالب علم ہے جو سبق یاد کرنے کا ارادہ ہی نہیں کرتا اور جب وہ ارادہ نہیں کرتا تو کوشش بھی نہیں کرتا۔ پس ان

میں سے ارادہ کرنے والا سبق تو یاد کرلے گا اور نہ کرنے والا نہیں کرے گا۔ دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ ایک طالب علم ارادہ تو کرتا ہے مگر اس ارادہ کے مقابلہ میں جو کام اس کے سپرد ہے وہ زیادہ ہے۔ طالب علم سبق یاد کرنے کا ارادہ تو کرتا ہے مگر استاد بیوقوفی سے ایسی کتاب کا سبق اسے دے دیتا ہے جس کا وہ اہل نہیں۔ مثلاً پرائمری کے طالب علم کو ایم۔اے کی کوئی کتاب پڑھاتا ہے اب یہاں ارادہ تو ہے مگر کام اتنا مشکل ہے کہ ارادہ اس پر غالب نہیں آسکتا یا ارادہ تو ہے مگر حافظہ اتنا خراب ہے کہ اس کی خرابی ارادہ پر غالب آجاتی ہے۔ اس لئے جب تک ارادہ کی طاقت اور نہ بڑھ جائے یا جب تک اس سے زیادہ حافظہ پیدا نہ کیا جائے اُس وقت تک سبق یاد نہ ہوگا۔ یا مثلاً حافظہ بھی اچھا ہے ارادہ بھی ہے مگر طالب علم کسی جگہ ملازم ہے اور اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ سبق یاد کرسکے وہ جلدی جلدی کام ختم کرتا ہے کہ کتاب یاد کرنے کیلئے وقت مل جائے مگر وہ اِدھر کتاب لے کر بیٹھتا ہے اور اُدھر اُس کا آقا اُسے دوسرا حکم دے دیتا ہے اور اسے مجبوراً کتاب رکھنی پڑتی ہے۔ اب یہاں ارادہ بھی ہے، حافظہ بھی ہے، یاد کرنے کی قابلیت بھی ہے مگر وقت نہیں۔ ایسے حالات میں ارادہ قوتِ مؤثرہ تھی اور سبق اور اس کے یاد کرانے کے ذرائع قوتِ متأثرہ اور اس کے معاون ارادہ نے جن آلات پر اثر ڈالنا تھا وہ اگر اس کے مؤید نہیں ہیں تو اس کی تمام کوششیں بے اثر رہیں گی۔ پس یہ دقتیں ہیں جن کی وجہ سے انسان کو ناکامی ہوتی ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہم میں قوتِ ارادہ دونوں امور میں یکساں موجود ہے۔

جب کوئی شخص ہماری جماعت میں داخل ہوتا ہے تو وہ یکساں قوت سے فیصلہ کرتا ہے کہ اپنے عقائد اور اعمال دونوں کی اصلاح کرے گا۔ جب کوئی بچہ ہم میں پیدا ہوتا ہے تو وہ یکساں قوت کے ساتھ ارادہ کرتا ہے کہ وہ اسی طرح اپنے اعمال کو درست کرے گا جس طرح عقائد کو مگر ہر داخل ہونیوالا شخص اور ہر بالغ ہونے والا بچہ ایک ہی جیسی طاقت اور ارادہ کے باوجود عقائد کی اصلاح میں تو کامیاب ہوجاتا ہے لیکن اعمال کی اصلاح میں نہیں۔ ہم یکسا نیت سے دشمن پر حملہ کرتے ہیں اس کے عقائد کو تو پہلے حملہ میں ڈگمگا دیتے ہیں لیکن اس کے اعمال میں سالہا سال کی کوشش کے باوجود ذرّہ تبدیلی نہیں کرسکتے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود اپنے اعمال میں بحیثیت جماعت ہم اصلاح کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ گو ہم میں سے افراد اعمال کی اصلاح میں بھی

کامیاب ہیں مگر ملّی اصلاح بعض افراد کی اصلاح سے نہیں ہوسکتی بلکہ اس کیلئے جماعتی اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے۔ جماعتی اصلاح دنیا کے سامنے ایک ایسا نظارہ پیش کرتی ہے کہ دوسرے اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں سب سے بڑی قوتِ عمل نقل ہے اس سے زیادہ اثر کرنے والی کوئی اور قوت موجود نہیں۔ نقل دنیا میں ایسے حیرت انگیز کام کراتی ہے کہ عقل کو بھی پردے میں چھپا دیتی ہے اور یہ چیز دنیا کی عقل اور سمجھ اور فہم پر اِس قدر غالب آجاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہماری گزشتہ تاریخ ابھی اتنی قدیم نہیں کہ نظروں سے اوجھل ہوسکے۔ ابھی قریباً سو سال کا ہی عرصہ ہؤا ہے کہ ہندوستان کا فیشن بالکل اسلامی تھا۔ لوگ جُبّے اور عمامے پہنتے اور داڑھیاں رکھتے تھے حتّٰی کہ ہندو بھی عمامے اور جُبّے پہنتے اور داڑھیاں رکھتے تھے مگر آج وہ زمانہ ہے کہ وہ لوگ جن کے گھروں سے یہ چیزیں نکلی تھیں وہ خود ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں، کوٹ پتلون اور ہیٹ کے دِلدادہ ہیں اور داڑھیاں مُنڈواتے ہیں۔ غور کرو کہ آج سے صرف سَو سال قبل وہ کونسی چیز تھی جس نے داڑھی کو معقول بنا دیا تھا، وہ کونسے دلائل تھے جنہوں نے جُبّے اور عمامے کے دوسرے سب لباس پر فوقیت دے دی تھی اور چھوٹے کوٹ کو ادنیٰ اور ذلیل قرار دے دیا تھا۔ صرف یہ کہ ایک قوم تھی جسے دنیا اچھا سمجھتی تھی وہ دوسروں کے اثر کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھی لوگ سمجھتے تھے کہ یہ قوم نہ کسی سے ڈرتی ہے نہ کسی کا اثر قبول کرتی ہے اور پھر ترقی اور عروج پر ہے اس لئے ضرور اس کے اندر کوئی خوبی ہے اس وجہ سے دوسروں نے بھی اس کی نقل شروع کر دی۔ پھر ایک اور قوم آئی جس کے پیچھے قوتِ ارادی موجود تھی وہ جُبّہ پوشوں کے سامنے چھوٹے کوٹ اور عماموں والوں کے سامنے ہیٹ پہنے پھرتی رہی، وہ مُنڈی ہوئی داڑھیوں پر استقلال سے قائم رہی، لوگ اُس پر ہنستے اور پھبتیاں اُڑاتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ مرد ہیں یا عورتیں؟ ان کے چھوٹے کوٹوں کو دیکھ کر لوگ مضحکہ اُڑاتے اور کہتے کہ کتنے کنجوس ہیں کیا دو گرہ اور کپڑا نہ ملتا تھا کہ لبادہ بنا لیتے، ان کے سروں پر ہیٹ دیکھ کر کہتے کہ یہ بھی کوئی لباس ہے جیسے بندر کے سر پر ٹوکری رکھی ہو مگر وہ لوگ اپنی بات پر قائم رہے اور آہستہ آہستہ نتیجہ یہ ہؤا کہ جو لوگ ان کی ہنسی اڑاتے تھے وہ بھی نقل کرنے لگے اور ساری دنیا میں یہی رَو چل گئی کہ چھوٹا کوٹ ہی اچھی چیز ہے، ہیٹ بہت آرام دہ ہے دھوپ سے

بچاتی ہے، یہاں تک کہ ترکوں نے حکم دے دیا ہے کہ جو سر پر پھندے دار ٹوپی نہ پہنے گا اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور جو داڑھی رکھے گا اُسے سزا دی جائے گی۔ داڑھی رکھنے اور لمبا کوٹ پہننے کیلئے لائسنس کی ضرورت ہے جس طرح بندوق کیلئے ہمارے ہاں لائسنس ضروری ہوتا ہے گویا داڑھی سے بھی کسی کو گولی ماری جاسکتی ہے۔ آخر کیا چیز تھی جس سے سَو سال کے اندر اندر دنیا میں اس قدر تغیر ہوگیا اور ترکوں میں تو یہ تبدیلی پندرہ بیس سال سے ہی ہوئی ہے پہلے وہ ہیٹ کے سخت دشمن تھے اور ان کا قومی لباس فیض کیپ[1] تھا جسے ہمارے ہاں رومی ٹوپی کہتے ہیں۔ باقی یورپین لباس تو خیر یورپ میں بھی ترکوں سے ہی گیا ہے لیکن فیض ابھی قریب میں ان کے ہاں موجود تھی اور پندرہ بیس سال پہلے اسے اُتارنا ترک اپنی ہتک سمجھتے تھے مگر آج جو اسے پہنے اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ یہ تغیر کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ بعض قومیں ایسی تھیں جو ہیٹ پہنتی تھیں اور شرماتی نہیں تھیں انہیں دنیوی عزت حاصل تھی اس لئے دوسروں نے خیال کیا کہ شاید ترقی اسی میں ہے۔

نقالوں کی مثال تو ایسی ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ کسی ملک میں کوئی شخص طب نہ جانتا تھا وہاں ایک طالب علم تھا جو بہت ہوشیاری کا دعویٰ کرتا تھا اور لسّان تھا مگر دراصل بیوقوف تھا وہاں کے لوگوں نے اسے اپنے ہمسایہ ملک میں طب سیکھنے کیلئے بھیجا اور اس کے ملک کے رؤساء نے اپنے واقفوں اور آشناؤں کے نام اسے خطوط وغیرہ بھی دیئے۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک طبیب کے شاگردوں میں داخل ہوگیا۔ ابھی دو تین روز ہی ہوئے کہ طبیب کسی مریض کو دیکھنے گیا اور اسے بھی قلمدان اُٹھا کر ساتھ چلنے کو کہا۔ وہاں جا کر مریض کی نبض دیکھی اور اسے کہا کہ آپ نے کل چنے کھا لئے بھلا آپ ایسے نازک مزاج کو چنے کہاں ہضم ہو سکتے ہیں پیٹ درد اسی وجہ سے ہے اسے نسخہ لکھ دیا اور واپس آ گیا۔ وہ طالب علم استاد کے مکان پر پہنچ کر کہنے لگا کہ بس اجازت دیجئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس نے پوچھا کیا طب سیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا؟ اُس نے کہا نہیں بس میں پڑھ چکا، ہوشیار آدمی بہت جلد سیکھ سکتا ہے وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ استاد نے کہا کہ اتنی جلدی طب کہاں سیکھی جاسکتی ہے؟ اس نے کہا نہیں جی! ہوشیار آدمی کیلئے کیا چیز مشکل ہے اصل چیز تشخیص ہے سو اس کا گُر میں نے معلوم کرلیا ہے آگے علاج تو ہر ایک جانتا ہے۔ وطن پہنچا تو لوگوں نے کہا اتنی جلدی آ گئے؟ اس نے کہاں ہاں بس میں سیکھ آیا ہوں ہوشیار آدمی جلد سیکھ

سکتا ہے۔ وہاں کوئی رئیس بیمار ہؤا تو یہ طبیب صاحب بھی پہنچے اور چارپائی کے نیچے نظر ڈالنے کے بعد کہا کہ آپ نازک مزاج آدمی ہیں آپ نے گھوڑے کی زین کھالی بھلا وہ آپ کیونکر ہضم کر سکتے تھے۔ وہ رئیس غصہ سے بھر کر کہنے لگا کہ گستاخی کرتے ہو تمہیں علاج کیلئے بلایا ہے یا ایسی باتوں کیلئے؟ اور نوکروں سے کہا اسے خوب پیٹو جب خوب پِٹ چکا تو کہنے لگا کہ اُس طبیب نے جس سے میں نے طب سیکھی ایسی ہی بات کی تھی وہ مریض کو دیکھنے گیا تو میں بھی اُس کے ساتھ تھا اور تاڑتا رہا کہ کیا کرتا ہے۔ اس نے چارپائی کے نیچے دیکھا دو تین چنے کے دانے پڑے تھے اس نے مریض سے کہا کہ تم نے چنے کھائے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہی مریض نے کھائی ہوتی ہے۔ تو نقال ایسے ہی ہوتے ہیں کسی کو ترقی یافتہ دیکھا تو اس کے کاموں کی نقل شروع کر دی مگر اس وجہ سے کہ کبھی اس سے مضحکہ انگیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک معمولی طاقت ہے یا بُری چیز ہے اس میں زبردست طاقت ہے اور جس طرح اس سے بُری باتیں پیدا ہوتی ہیں کبھی یہ اچھی تبدیلیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح مکہ تک عرب کے لوگ سمجھ سمجھ کر اسلام قبول کر رہے تھے لیکن فتح مکہ کے بعد ان میں سے بُہتوں نے محض نقل کے طور پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا گویا اسلام قبول کرنا اُس وقت فیشن ہو گیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ دس دس اور بیس بیس ہزار افراد پر مشتمل قبائل ایک وقت میں اسلام قبول کرتے تھے اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس بارہ میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ ہمارا مخالف قبیلہ پہلے داخل ہو جائے۔ تو وہ اسلام نقل کا تھا آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد زکوٰۃ کا فتنہ جب اُٹھا تو وہی نقال جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں جلدی کی تھی انہوں نے کفر کی طرف لَوٹ جانے میں بھی جلدی کی۔ ایسے سب قبائل نے ارتداد اختیار کر لیا حتّٰی کہ سارے عرب میں صرف تین جگہ نماز با جماعت ہوتی تھی۔ یہ اتنا نازک وقت تھا کہ حضرت عمرؓ جیسے بہادر انسان نے بھی حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ اِس وقت ہمیں ذرا نرمی اختیار کرنی چاہئے سارے ملک میں بغاوت ہو گئی ہے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جو لوگ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسّی زکوٰۃ میں دیتے تھے جب تک وہ یہ رسّی اب بھی نہ دینے لگیں گے میں ان سے لڑائی بند نہ کروں گا

خواہ خطرہ اتنا بڑھ جائے کہ دشمن مدینہ میں آ جائے اور مدینہ کی گلیوں میں مسلمان عورتوں کی لاشیں پڑی ہوں جنہیں کُتّے گھسیٹتے پھریں ۲؎ ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ان سے گفتگو کر کے باہر نکلے تو آپ کے دوستوں نے جو انتظار میں کھڑے تھے اور اسی فکر میں تھے پوچھا کچھ کامیابی ہوئی ؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اِس بڈھے کو بہت کمزور دل کا سمجھتا تھا مگر یہ تو ہم سب سے زیادہ بہادر ہے اور آخر خدا تعالیٰ کے فضل سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کو دوبارہ عرب میں قائم کیا اور تربیت کے ماتحت وہی عرب سچے مسلمان بن گئے ۔

غرض نقل ایک زبردست طاقت ہے جو کبھی نیکی کے پھیلنے میں مد ہوتی ہے اور کبھی بدی کے پھیلنے میں ۔ چنانچہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہی نقل جس نے ایک دفعہ اسلام کی اشاعت میں مدد کی تھی دوسرے وقت میں اس کے شعار کو مٹانے میں مدد کی اور وہ لوگ جو داڑھیاں رکھتے تھے ان سے داڑھیاں مُنڈوانے لگی ، کبھی اس نے خدا اور رسول پر ایمان کے اظہار میں مدد دی اور کبھی انکار میں ۔پس نقل اپنی ذات میں نہ اچھی ہے اور نہ بُری اسی لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ۳؎ ۔نقل کرنے والا اگر اچھی چیز کی نقل کرتا ہے تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور اگر بُری چیز کی نقل کرتا ہے تو بُرا ہو جاتا ہے۔نقل ایک شیشے کے کٹورے کی مانند ہے اس میں اگر دودھ ڈالا جائے تو دودھ نظر آتا ہے اور اگر پانی ڈالا جائے تو پانی۔اس میں کالا رنگ ڈالا جائے تو وہ کالا نظر آتا ہے اور اگر سُرخ رنگ ڈالا جائے تو سُرخ ،غرض وہ ہر رنگ کے قبول کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

درحقیقت اس زبردست طاقت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی بہتری کیلئے پیدا کیا ہے تا کامیابی کے راستہ پر اس کا سفر اس کیلئے آسان ہو جائے گو گندے لوگ اُسے بُری طرح استعمال کرنے لگ جاتے ہیں جیسے اور پاکیزہ اشیاء کو لوگ بُری طرح استعمال کرنے لگ جاتے ہیں ۔اس طاقت کی پیدائش کی اصل غرض یہ ہے کہ صداقت ایک وقت تک جدوجہد کرنے کے بعد جب اپنا سکّہ جمالے تو پھر اس کی اشاعت میں سہولت پیدا ہو جائے ۔ چنانچہ جب کوئی قوم ایسے مقام پر کھڑی ہو جاتی ہے کہ لوگ اُس کی نقل کریں تو وہ کامیاب ہو جاتی ہے ورنہ ایک ایک اور دو دو کو منوانا بڑا لمبا کام ہے۔اس طرح منوانے کیلئے ایک بڑا لمبا عرصہ کامیابی کیلئے درکار ہوتا ہے اور دنیا

کب تک انتظار کرسکتی ہے۔ چنانچہ اپنی ترقی کو ہی دیکھ لو اگر لوگ اسی طرح ہماری جماعت میں داخل ہوتے رہیں جس طرح اب ہوتے ہیں یعنی ایک ایک دو دو یا جس طرح رسول کریم ﷺ کے ابتدائی زمانہ میں داخل ہوتے تھے تو شاید ہم ہزار سال میں اتنے لوگوں کو بھی احمدی نہ کرسکیں جتنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک اسلام لائے تھے۔ کامیابی اُسی وقت ہوتی ہے جب لوگ نقل کرنے لگیں۔ اگر جس چیز کی نقل کی جائے سچی ہو تو اس کی نقل کرنے والے بھی عقل والوں جیسے ہی ہو جاتے ہیں کیونکہ تربیت سے سچائی ان کے دلوں میں بٹھا دی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ دخول کے وقت وہ نقل سے کام لیتے ہیں اور عقل بعد میں آتی ہے مگر نیک امر کی نقل کرنے والا باوجود اس کے کہ اُسے ابھی عقل سے حصہ نہیں ملا ہوتا بوجہ اس کے کہ وہ اچھی اور معقول بات کی نقل کر رہا ہوتا ہے دوسروں سے ذہین ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے کئی دفعہ پیرے کی مثال سنائی ہے وہ کم عقل آدمی تھا صرف نقل سے اُس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مانا مگر جب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اُسے کہا کہ تم قادیان میں کیوں رہتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں کوئی پڑھا لکھا آدمی تو نہیں ہوں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مرزا صاحب ریلوے سٹیشن سے بارہ میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں اور لوگ خود بخود ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں مگر آپ روز سٹیشن پر آتے ہیں اور آپ کی جُوتیاں بھی گھس گئی ہیں مگر پھر بھی آپ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ دلیل اس کی ٹھیک تھی گو اسی حد تک جس حد تک پیرے کے ایمان کا سوال تھا۔

دنیا کی جتنی تسلی نقل سے ہوتی ہے اُتنی دلائل سے نہیں ہوتی۔ نقل میں پونچھ پکڑنے والی بات ہوتی ہے سچائی جب ایک حد تک ترقی کر جاتی ہے تو لوگ اس میں داخل ہونے کیلئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ اُس وقت وہ کوئی معمولی سی دلیل بھی سُن لیں تو کہہ دیتے ہیں کہ بس اب ہم سمجھ گئے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اُس دھوبی کی سی ہوتی ہے جسے کہتے ہیں روز گھر والوں سے روٹھنے کی عادت تھی۔ ایک دن اس کے بیوی بچوں نے فیصلہ کیا کہ اگر اب یہ روٹھے تو اسے منایا نہ جائے کیونکہ روز منانے سے یہ سر چڑھ گیا ہے۔ اگلے روز وہ پھر روٹھ گیا اور کہنے لگا میں گھر میں نہیں رہوں گا اور بیل لے کر باہر چلا گیا۔ دن بھر انتظار کرتا رہا کہ کوئی منانے آئے گا مگر کوئی نہ آیا۔ اُدھر بھوک نے تنگ کیا تو شام کے وقت بیل کو چھوڑ دیا اُس نے گھر کو ہی جانا تھا کیونکہ اسے یہی عادت تھی کہ صبح

گھر سے آتا اور شام کو گھر کو چلا جاتا۔ دھوبی نے اُس کی دُم پکڑ لی اور پیچھے پیچھے یہ کہتا ہؤا کہ چھوڑ و بھی یار تم مجھے یونہی زبردستی گھر لے جارہے ہو میں نہیں جانا چاہتا گھر آ گیا۔ تو جب کوئی قوم ایسے مقام پر کھڑی ہو جائے کہ دوسرے اس کی نقل کرنے لگیں تو پھر ڈر اور خوف جاتا رہتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ قوم صبح شام، دن رات بڑھتی ہی جاتی ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، ممکن ہے اس کی مخالفت سے ہم پر کوئی عذاب آئے اور وہ اُس کے ساتھ ملنے کیلئے بہانے کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اور جب کوئی جا کر تبلیغ کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس طرح تو آج تک ہمیں کسی نے سمجھایا ہی نہ تھا اور جھٹ ایمان لے آتے ہیں۔ تو نقل دونوں طرح کام کرتی ہے مگر یہ مقام حاصل کرنے کیلئے ایک حد تک طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک اس خاص معیار پر کوئی قوم نہ پہنچ جائے لوگ اس کی نقل نہیں کرتے۔ پس ماننا پڑے گا کہ نقل میں بھی فائدے ہیں اور خدا نے اسے بے وجہ پیدا نہیں کیا اور فائدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی اشاعت میں بھی اس سے مدد لیتا ہے۔ داخل ہونے کے بعد منوانا آسان ہو جاتا ہے کیونکہ داخل ہونے کے بعد انسان حکومت کے اندر آ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ سہولت پیدا کس طرح ہوتی ہے تا اسے حاصل کیا جا سکے۔ لوگ آج عقائد کے بارہ میں ہماری نقل کر رہے ہیں، آج لوگ اگرچہ یہ نہیں جانتے کہ وفاتِ مسیحؑ سے اسلام کے کیا فوائد وابستہ ہیں مگر وہ اُسے مانتے ہیں، سارے قرآن کو محفوظ سمجھنے کے فوائد وہ نہیں جانتے مگر یہ عقیدہ ان کا ہو گیا ہے، الہام کے جاری ہونے کی پوری حکمت وہ نہیں سمجھتے مگر عیسائیوں اور آریوں سے مقابلہ کے وقت وہ اسلام کی فضیلت کے طور پر اُسے پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ صفاتِ الٰہیہ کے کمال کا اقتضاء یہ ہے کہ سب قوموں میں نبیوں کی آمد تسلیم کی جائے مگر دوسروں کے سامنے وہ یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے، لیکن ابھی ہمارے اعمال کی لوگوں نے نقل شروع نہیں کی اور میں نے پچھلے بعض خطبات میں بتایا تھا کہ اس رستہ میں ہمارے لئے کچھ دقتیں ہیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ جب قوتِ ارادی یکساں ہے تو یہ امتیاز کیونکر پیدا ہؤا ہے۔

میرے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قوتِ متأثرہ کی کمزوری اور اس کے معاونین کا نقص ہے۔ ایک چاقو سے ہم سنگترہ کاٹ سکتے ہیں مگر لوہے کی سلاخ نہیں کاٹ سکتے، ریتی سے لوہے کو چھیل سکتے ہیں مگر ہیرے کو نہیں کیونکہ وہ زیادہ سخت ہوتا ہے۔ پس معلوم ہؤا کہ اعمال

کے متعلق ہماری روکیں عقائد کی روکوں سے زیادہ سخت ہیں اور وہ میں بیان کر چکا ہوں کہ کیا ہیں۔

اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ان روکوں کو دور کرنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اگر ہم دوسروں پر غالب آنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے اس سے ہمارے اندر ایسی قوت پیدا ہو جائے گی کہ دوسروں کی اصلاح کر سکیں۔ دوسروں سے نقل کرانے کیلئے بہادری اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم مضبوطی سے ان چیزوں پر قائم ہو جاتی ہے تو دوسرے خود بخود اُس سے مرعوب ہونے لگتے ہیں اور پھر اس کی نقل شروع کر دیتے ہیں۔ جب دنیا میں لوگ بُری سے بُری باتوں کی نقل کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی باتوں کی نہ کریں۔ اب انگریزوں میں ناچ کا رواج ہے مگر پہلے اُسے بُرا سمجھا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے اختیار کرنا شروع کیا۔ پہلے پہلے عورت اور مرد ہاتھ پکڑ کر ناچتے تھے، پھر سینہ کی طرف سینہ کر کے، پھر یہ سلسلہ ترقی کر کے فاصلہ تین انگلی تک آ گیا اور اب بہت جگہ پر یہ بھی اُڑتا جاتا ہے۔ تو جس چیز کو بہادری اور استقلال سے قائم رکھا جاتا ہے لوگ اس کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں جب پہلے پہل داڑھیاں مُنڈوانے کا حکم دیا گیا تو بعض درباریوں نے اپنے عہدے ترک کرنے اور دربار سے نکلنا منظور کر لیا مگر داڑھیاں مُنڈوانے پر رضامند نہ ہوئے مگر آج کوئی داڑھی رکھنا پسند نہیں کرتا۔ تو ہر چیز کے بدلنے سے پہلے ایک طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جب لوگ اسے پیدا کر لیتے ہیں تو دوسرے ان کی نقل شروع کر دیتے ہیں اور جب تک وہ پیدا نہ ہو نقل کرانا دشوار ہوتا ہے اور ہم نے اپنے اندر اسی طاقت کو پیدا کرنا ہے مگر اس کے رستہ میں بہت سی روکیں ہیں جن کے مقابلہ کیلئے ہم نے قواعد تجویز کرنے ہیں۔ اس کیلئے ہمیں اپنے نفسوں کی قربانی اور ایک ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک یہ چیزیں ہمیں حاصل نہ ہوں گی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے یہ چیزیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں اس کے متعلق تفصیلی طور پر تو میں ابھی بیان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تحریک جدید کا دوسرا حصہ ہے اور اس کے بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلا حصہ پورا ہو جائے۔ جب تک پہلا امتحان پاس نہ کر لیا جائے دوسرے کی طرف قدم اُٹھانا کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے جماعت کو بارہا توجہ دلائی ہے کہ وہ ان مشکلات پر اور ویسی ہی دوسری مشکلات پر جو ہمارے سامنے آئیں غور کرے کہ ان کا کیا علاج ہے وہی علاج ہماری کامیابی کا

علاج ہوگا۔ ہر احمدی اس بات پر غور کرے اور یقیناً آپ میں سے ہر ایک کا دل یہی گواہی دے گا کہ ہمارے ارادہ میں کمی نہیں، ارادہ اعمال کی اصلاح کے متعلق بھی ویسا ہی ہے جیسے عقائد کی اصلاح کے بارہ میں۔ نقص قوتِ متأثرہ میں ہے۔ جن پر ہمارے ارادہ نے اثر انداز ہونا ہے ان میں نقص ہے۔ ہمارے پاس چاقو موجود ہے مگر جس چیز کو اس سے کاٹنا ہے وہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ یا ہمیں اس کو نرم کرنا پڑے گا اور یا پھر چاقو کو تیز کرنا ہوگا اس کے سوا چارہ نہیں۔ سخت چیز کو نرم کر کے بھی اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے جیسے سونا چاندی ہے اس کا کشتہ بنالیا جاتا ہے۔ لوہا کتنی سخت چیز ہے مگر اس کا بھی کشتہ بنالیا جاتا ہے پس یا تو قوتِ ارادی کو زیادہ مضبوط کرو اور یا پھر قوتِ متأثرہ کے نقص کو دور کرو۔ یہی دو علاج ہیں۔ اگر ہم اپنے ارادوں میں اتنی طاقت پیدا کرلیں کہ وہ سب روکوں کو مٹادے تو پھر بھی ہم کامیاب ہوسکتے ہیں اور ایسی قوتِ ارادی ایمان سے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ ایمان جس قدر مضبوط ہوگا اسی قدر قوتِ ارادی مضبوط ہوگی اگر ایمان کمزور ہو تو قوتِ ارادی بھی کمزور ہوگی۔ حضرت مسیح ناصریؑ نے فرمایا کہ اگر تمہارے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو تو تم پہاڑوں کو چلا سکتے ہو مگر جب تک یہ مقام حاصل نہ ہو اُس وقت تک جدوجہد کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ بے شک یہ ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہم میں سے بعض کو وہ مقام دے دے کہ ہم جو چاہیں ہو جائے مگر ساری جماعت یہ مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ باقیوں کیلئے جدوجہد کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی اور اس کیلئے ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ کونسی تدابیر ہیں جن سے ساری جماعت کامیابی کا منہ دیکھ سکے اور ان روکوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہمارے رستہ میں ہیں ایسے علاج تجویز کرنے چاہئیں کہ باوجود ان کے ہم کامیاب ہوسکیں۔ وہ تدابیر کیا ہیں؟ ان کی تفاصیل تو میں ابھی بیان نہیں کرسکتا ہاں اجمالی طور پر اس کا ذکر اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو آئندہ خطبہ میں کردوں گا اور باقی کو اُس وقت تک ملتوی رکھوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جماعت پہلا قدم اُٹھالے۔ (الفضل ۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء)

---

۱ فیض کیپ: (FEZ CAP) تُرکی ٹوپی

۲ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۱۵، مطبوعہ لاہور ۱۸۹۲ء

۳ ابوداؤد کتاب اللباس باب فی لبس الشھرۃ